

ابوطالب کے ایمان و کفر کی تحقیق

سوال نمبر ۱: آنحضرت ﷺ کا خطبہ نکاح ابوطالب نے پڑھا، اس سے الفاظ کفر دکھائیں؟

جواب نمبر ۱: سیرت ابن و ہشام عربی میں وہ خطبہ موجود نہیں البتہ **روض الانف سہیلی**، جلد نمبر ۱، صفحہ نمبر ۱۲۲ میں بحوالہ سیرت المصطفیٰ ﷺ، جلد نمبر ۱، صفحہ نمبر ۹۳ سے خطبہ نکاح کے اتنے لفظ ملے ہیں:

اما بعد فان محمداً ممن لا يوازن به فتى من قريش الارجع به شرف ونبلاً وفضلاً
وعقلاً وان كان فى المال قل فانه ظل زائل وعارية مسترجعة وله فى خديجة بنت
خويلد رغبة ولها فيه مثل ذالك

محمد ﷺ وہ ہیں کہ قریش میں سے جو بھائی بھی شرف اور رفعت اور فضیلت اور عقل میں آپ کے ساتھ تو لا جائے تو آپ ہی بھاری رہیں گے۔ مال میں اگرچہ آپ کم ہیں لیکن مال ایک زائل ہونے والا سایہ ہے اور واپس کی جانے والی مانگی ہوئی چیز ہے یہ خدیجہ بنت خویلد کو چاہتے ہیں اور وہ ان کو چاہتی ہے۔

اس خطبہ میں نہ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کا اقرار ہے نہ حضرت محمد ﷺ بن عبد اللہ کو رسول و نبی کہا گیا ہے جو مدار ایمان ہے تو محض خطبہ پڑھنے سے حضرت ابوطالب کو مؤمن نہ کہا جائے گا ہاں اُس وقت کفر کی بھی صراحت نہیں ہے کیوں کہ آپ نے تو حید و رسالت کی ابھی دعوت بھی نہیں دی تھی تو وہ کس چیز کا انکار کر کے کافر کہلاتے جیسے پندرہ سال بعد بعثت کے وقت کلمہ تو حید و رسالت کا انکار کرنے کی وجہ سے بشمول ابوطالب کئی قریش کافر بنتے گئے۔ اس تو جیہہ سے حضور ﷺ کے والدین سے بھی ہم کفر کی نفی کرتے ہیں۔

سوال نمبر ۲: صحرا میں ابوطالب کو آنحضرت ﷺ نے پانی پلایا اور آنحضرت ﷺ سے بیماری میں ابوطالب نے دعا کرائی، صحت پائی (ابن سعد اصابہ خصائص کبریٰ، جلد نمبر ۱، صفحہ نمبر ۱۸۵) کیا یہ مقام حق الیقین نہیں ہے؟

جواب نمبر ۲: سب قریش حضور ﷺ کو امین، صادق، نیک، بزرگ اور مستجاب الدعوات خدا کا بندہ جانتے تھے۔

اگر ابوطالب نے کلمہ پڑھے بغیر آپ ﷺ سے دعا کرائی اور چشمہ پھوننے کا معجزہ دیکھا تو اپنی قوم سے انوکھا کام نہیں کیا۔ اس سے حق الیقین تو کیا، نفس ایمان بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اگر دولت ایمان حاصل ہوتی تو طلب کے باوجود اپنی بیٹی اُمّ ہانی کا رشتہ حضور ﷺ سے کرتے، ہیرہ بن ابی وہب مخزومی سخت کافر سے نہ کرتے (اصابہ وابن سعد) نیز گھر کا ماحول مومنانہ ہوتا۔ ورنہ کیا وجہ کہ آپ کے بیٹے حضرت جعفرؓ اور حضرت علیؓ جو آپ کی ناداری کی وجہ سے حضرت عباسؓ اور آنحضرت ﷺ کی پرورش میں تھے، دولت ایمان سے مشرف ہوئے اور اپنے زیر کفالت طالب اور عقیل (حضرت عقیلؓ) کافر رہے۔ طالب بدر میں مقتول ہوا اور حضرت عقیلؓ قید ہوئے جو کہ بعد میں فتح مکہ پر مسلمان ہوئے۔

سوال نمبر ۳: ابوطالب نے شعیب ابی طالب کی قید سے خلاصی پا کر یہ دعا کی تھی **اللهم انصرنا علی من ظلمنا و قطع رحمنا و استحل ما یحرم علینا**۔ کیا منکر خدا ایسی دعا مانگتا ہے؟

جواب نمبر ۳: جب آغاز اسلام میں مکہ والوں پر تکذیب کی وجہ سے قحط سالی کا عذاب آیا جس کا ذکر پارہ نمبر ۱۴ رکوع نمبر ۲۱ میں ہے، تو سب کفار آپ سے دعائیں کرا نے آتے تھے اسی طرح فتح مکہ سے پہلے حضرت ابوسفیانؓ معاہدہ تحریر کرا نے آئے تھے تو قحط زدہ قوم کے لیے دعا کرا نے کی آنحضرت ﷺ سے درخواست کی تھی۔ سب کفار قریش خدا کو مانتے اور اس سے دعائیں کرتے تھے تو مشرک و کافر منکر خدا نہیں ہوتا ہاں، اللہ کا شریک بنات اور شریعت و رسالت کا انکار کرتا ہے۔

سوال نمبر ۴: کوئی ایسی روایت بتائیں جس میں ابوطالب کی بت پرستی کا ذکر ہو؟

جواب نمبر ۴: شیعہ کی معتبر کتاب سے حوالہ پیش خدمت ہے:

”حضرت جعفر صادقؓ سے منقول ہے کہ ابوطالب کی مثال اصحاب کہف کی سی ہے، جو ایمان کو اپنے دل میں

چھپائے ہوئے تھے اور عملاً شرک کا اظہار کیا کرتے تھے جس کے عوض خدا نے ان کو دوسرا اجر عطا فرمایا تھا۔“

(ترجمہ مقبول شیعہ، صفحہ نمبر ۴۶۹، پارہ نمبر ۲۰، زیر آیت **انک لا تھدی...**)

حضرت جعفر صادقؑ کی اس سچی خبر سے پتہ چلا کہ آں جناب عملاً شرک کا ارتکاب کرتے تھے اور یہی قریش کا مروجہ بت پرستی والا مذہب تھا۔ بت پرستی کے سوا شرک عملی کی اور کوئی صورت ہو تو شیعہ ہی بتائیں؟ اس میں اصحاب کھف کی مثال بالکل بے ربط اور غلط ہے کیوں کہ وہ ظاہراً اور باطناً مؤحد تھے۔ اللہ فرماتا ہے:

”بے شک وہ ایسے جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا تھا جب کہ وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا پروردگار تو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے ہم ہرگز اس کے سوا کسی دوسرے ہو کو نہ پکاریں گے۔ (اگر ایسا کریں) تو اس صورت میں گویا ہم نے بہت ہی ناسزا بات کہی۔ ہماری قوم نے تو اس کے سوا بہت سے خدا بنالے ہیں۔ پھر ان خداؤں کے متعلق کوئی دلیل کیوں نہیں پیش کرتے پس اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے اور اب جب تم ان سے الگ ہو چکے ہو اور جن چیزوں کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں۔ ان کو چھوڑ چکے ہو تو کسی غار میں چل رہو۔۔۔ الخ“۔

(ترجمہ مقبول شیعہ، صفحہ نمبر ۳۵۲، پارہ نمبر ۱۵، سورۃ کھف، رکوع نمبر ۲)

یہ ایک کھلی تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت ابوطالب نے نہ کلمہ تو حید و رسالت پڑھا، نہ اتباع پیغمبر ﷺ میں اپنی قوم کو بت پرستی کی تردید کی نہ ان سے علیحدہ ہوئے، نہ کافروں نے ان کو اپنے مذہب کا مخالف اور مسلمان سمجھ کر تکلیف و ایذا پہنچائی جیسے انہوں نے آپ کے صاحبزادے حضرت جعفر طیارؑ کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا تو وہ اصحاب کھف جیسے کیسے ہوئے؟ یہ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جو شیعوں کے امام کو ہی زیب دیتا ہے۔

سوال نمبر ۵: ایسی روایت بتائیں جو یہ ثابت کرے کہ فلاں وقت ابوطالب نے عقیدہ تو حید کی مخالفت کی؟

جواب نمبر ۵: موافقت بھی نہیں کی تبھی تو آپ کا نام عبد مناف بت کے نام پر تھا اور بیٹے جعفرؑ نے ہجرت کی۔ سنی

و شیخہ کی متفقہ قدیم ترین کتاب ”سیرت ابن ہشام“ میں ہے کہ:

”اہل علم کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نماز کے وقت مکہ کی گھاٹیوں میں چلے جاتے۔ حضرت علیؓ جب کہ دس سال کے لڑکے تھے، اپنے باپ، سب چچوں اور باقی قوم سے چھپ کر آپ ﷺ کے ساتھ ہو جاتے اور نمازیں پڑھتے، شام کو واپس آتے۔ ایک عرصہ تک جتنا اللہ نے چاہا ایسا کرتے رہے ایک دن ابوطالب کو ان کے نماز پڑھنے کا پتہ چل گیا تو رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ یہ کون سا دین ہے جس کا پابند میں تم کو دیکھ رہا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے چچا! یہی اللہ کا، اللہ کے فرشتوں کا، اللہ کے پیغمبروں کا اور ہمارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے، اور تمنا مال ﷺ مجھے اللہ نے یہی دین دے کر بندوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اے چچا! جن لوگوں کی غیر خودی کر کے میں ان کو ہدایت کی طرف بلاؤں اور وہ میری بات مانیں اور میری امداد کریں ان سب سے زیادہ اس دین کو ماننے کے آپ حق دار ہیں، تو ابوطالب نے کہا

ای ابن اخی انی لا استطیع ان افارق دین آبائی وماکانو علیہ

اے بھتیجے! میں اپنے باپ دادا کا دین اور جس چیز (بت پرستی) پر وہ تھے اسے نہیں چھوڑ سکتا لیکن میری موجودگی میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچ پائے گی۔“ (ج ۱ ص ۲۶۲، ذکر اسلام علیؓ، مطبوعہ بیروت ۱۳۵۵ھ)

اگر ابوطالب مخالف تو حید نہ ہوتے تو حضرت علیؓ کو آپ سے چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر آپ نے صاف طور پر اس تو حید و رسالت اور ایمان کو اپنے بیٹے حضرت علیؓ کی طرح قبول کیوں نہ کر لیا اور اپنے باپ دادا کے مذہب پر کار بند رہنے کا اصرار کیوں کیا؟ صرف سربراہ خاندان کی حیثیت سے اتنی حمایت ظاہر کی کہ میری زندگی میں آپ کو تکلیف نہ پہنچے گی۔ ایسی حمایت کتنے شریف غیر مسلم آج بھی اپنے مسلم رشتہ داروں کی کرتے رہتے ہیں، جو ان کے ایمان و اسلام کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

سوال ۶: ایسا واقعہ بتائیں کہ ابوطالب نے غیر اللہ معبودوں کی حمایت و تعریف کی ہو؟

جواب نمبر ۶: آباء و اجداد کی مذکورہ بالا تصریح جواب کافی ہے کیوں کہ بت پرست آباء و اجداد کے مذہب پر اصرار، رسول خدا ﷺ کی توحید و ہدایت کے بالمقابل، غیر اللہ کی حمایت و تعریف ہی ہے۔

سوال نمبر ۷: کیا شعب ابی طالب میں ابو طالب نے غیر خداؤں کی عبادت کی؟

جواب نمبر ۷: اس کے متعلق کتب سیرت میں صراحت ہے:

”ابو طالب نے مجبور ہو کر مع خاندان کے شعب ابی طالب میں پناہ لی۔ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب مؤمن اور کافر سب نے آپ کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں نے دین کی وجہ سے اور کافروں نے خاندانی اور نسبی تعلق کی وجہ سے بنو ہاشم میں سے صرف ابوہب قریش کا شریک رہا۔“ (سیرت المصطفیٰ ﷺ ج ۱ ص ۲۰۰، ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۹ اور ابن ہشام ج ۱ ص ۲۲ طبع قدیم)

پتہ چلا کہ خاندانی لحاظ سے یہ شرکت شعب مؤید ایمان نہیں ہے۔ پھر غیر اللہ کی عبادت کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ بت ہر وقت پاس یا سامنے ہوں ان سے غائبانہ استعانت بھی شرک ہے۔ یہ کافر لوگ شعب ابی طالب میں بھی یقیناً اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوں گے اور حضور ﷺ کے پیچھے ان کے نمازیں پڑھنے کا تو کوئی ثبوت نہیں تو فیصلہ اصل بنیاد پر ہوگا کہ کافر اپنے مذہب پر رہے۔ خواہ بت پرستی کا ذکر نہ ملے اور مسلمان اپنے مذہب پر رہے۔

سوال نمبر ۸: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام غیر اللہ کا ذبیحہ نہ کھاتے تھے، ابو طالب کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ابو طالب مشرک نہ تھے!

جواب نمبر ۸: ابو طالب کے دسترخوان پر ہمیشہ کھانا مسلم نہیں تاریخ میں ہے کہ جناب عبد المطلب نے آپ ﷺ کو اپنے بڑے مال دار صاحب زادے زبیر کے سپرد کیا ان کے ہاں آپ ﷺ کی پرورش ہوئی جو

معابدہ حلف الفضول (جب حضور ﷺ کی عمر ۲۳ برس تھی) میں شریک تھے۔ پھر آپ ﷺ مستقل صاحب روزگار اور تاجر بن گئے اور اپنا کھاتے تھے۔ علاوہ ازیں غیر اللہ کا ذبیحہ ان کے کھانوں اور مخصوص میلوں، عرسوں پر بٹا تھا۔ حضور ﷺ نے واقعی ایسا گوشت اور تبرک کبھی نہ کھایا، گھر کا تیار شدہ کھانا ایسا نہ ہوتا تھا یا وہ بازار سے خریدا جاتا یا گھر میں بنام خدا ذبح کر کے تیار کیا جاتا تھا اور یہ تو معلوم ہے کہ اس وقت بھی مشرک ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے تھے اور تکبیر پڑھ کر ذبح کرتے تو اس کا کھانا حلال تھا۔ مشرک کے ذبیحہ کی حرمت **بسم اللہ** **اللہ اکبر** پڑھنے کے باوجود وہ خالص اسلامی مسئلہ ہے جو بعد میں اسلام نے پیش کیا۔ اس کا اطلاق عہد جاہلیت کے عام ذبیحوں پر نہیں کیا جائے گا۔ جیسے شریعت ابراہیمی کے مطابق نکاح جائز تھے گھروں میں ذبیحے بھی درست تھے۔

نوٹ: ہم نے بادل نحو استہ ان سوالات کے جوابات میں حضرت ابوطالب متعلق شیعہ غلو کی نفی کی ورنہ ہمیں آپ کی ذات سے بغض و کدورت نہیں بلکہ ہم دعویٰ نبوت کے بعد ایمان کی کفار کے مقابل حضور ﷺ کی حمایت اور طرف داری کا پورا احترام کرتے ہیں اور فقط حضرت، جناب وغیرہ کے ساتھ ان کا باادب ذکر کرتے ہیں مگر ان کا اسلام قبول نہ کرنا ایک تاریخی حقیقت ہے اور اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی **سیرت المصطفیٰ ﷺ ج ۱ ص ۲۰۷** حاشیہ پر فرماتے ہیں ”اہل سنت میں ان کے کفر کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ روافض ابوطالب کے ایمان کے قائل ہیں۔“ اہل سنت کے مختصراً دلائل یہ ہیں:

۱۔ **مسند احمد، بخاری، مسلم اور نسائی** میں ہے کہ جب آپ ﷺ نے ابوطالب کے سامنے مرتے وقت کلمہ پیش کیا کہ ایک مرتبہ پڑھ لو تا کہ تمہاری سفارش کر سکوں۔ اس وقت ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ نے کہا ”کیا تم عبد المطلب کی ممت کو چھوڑتے ہو؟“ تو ابوطالب نے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کہنے سے انکار کر دیا اور آخری کلمہ **عَلِيٌّ مَوْلَا عَبْدِ الْمَطْلَبِ** کہا۔ بعض روایات میں ہے کہ یوں کہا کہ میں نے آگ کو کلمہ پڑھنے کی

شرمندگی پر (روؤسا کے سامنے) ترجیح دی۔ پھر حضور ﷺ تو کمال شفقت سے استغفار کرنے لگے مگر یہ آیت نازل ہونے پر چھوڑ دیا ”نبی اور ایمان والوں کے لیے جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے استغفار کریں خواہ ان کے رشتہ دار بھی ہوں۔“ (سورہ توبہ)

اور یہ آیت بھی نازل ہوئی:

اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَخْبَتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ

آپ ﷺ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ (نقص پارہ ۲۰ رکوع ۹)

۲۔ شیعہ تفسیر البرہان ج ۳ ص ۲۱ میں ہے کہ یہ آیت ابوطالب کے حق میں اتری۔

۳۔ ترجمہ مقبول شیعہ ص ۲۶۰ تا شیعہ آیت بالا میں تفسیر مکی کے حوالے سے مذکور ہے کہ ”یہ آیت حضرت ابوطالب عم رسول خدا ﷺ کی شان میں نازل ہوئی۔ آنحضرت ﷺ ان سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ چچا جان لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دیجیے میں قیامت کے دن اس کے لیے آپ کو نفع پہنچاؤں گا اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ پیارے بھتیجے میں اپنی ذاتی حالت سے خوب واقف ہوں۔“

۴۔ اہل سنت کی فتح الباری ج ۷ ص ۱۳۸ پر حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ”جب ابوطالب مر گئے تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ کا گمراہ چچا مر گیا آپ ﷺ نے فرمایا ”دفن کر آؤ“ میں نے عرض کی ”وہ تو مشرک مرا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں، دفن کر آؤ۔“ یہ حدیث ابوداؤد و نسائی میں ہے۔ حافظ عسقلانی ”اصابہ میں فرماتے ہیں ”ابن خزیمہ نے اس حدیث کو صحیح بتلایا ہے۔“ (اصابہ ج ۳ ص ۱۱۷)

۵۔ ”مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا“ اس مسئلہ پر فقہاء نے استدلال موت ابی طالب سے کیا ہے کیوں کہ ان کے چار بیٹے تھے طالب، عقیل، (فتح مکہ پر مسلمان ہوئے تھے)، جعفرؓ و علیؓ، ابوطالب کی میراث صرف طالب اور عقیلؓ کو ملی جو (اس وقت) باپ کے مذہب (شُرک) پر تھے۔ اور علیؓ و جعفرؓ کو نہیں ملی کہ یہ

دونوں مسلمان تھے۔ (المعتد فی المعتقد)

۶۔ شیعہ بھی ان کے صرف باطناً مؤمن ہونے کے قائل ہیں۔ مسلمان ہونے اور کلمہ پڑھنے کے قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی کسی روایت سے بھی ان کا کلمہ پڑھنا، خود کو مسلم کہنا یا مؤمن ہونے کا دعوے دار ہونا ہرگز ہرگز ثابت نہیں کر سکتے۔ جب اسلام کے لیے اقرار شہادتین شرط ہے اور تبراً از کفار بھی ضروری ہے یہ دونوں باتیں ابوطالب میں نہ پائی گئیں تو ایمان کا دعویٰ بے بنیاد ثابت ہوا۔ پھر شیعہ خداتِ رسول ﷺ کی بناء پر آپ کو مؤمن نہیں کہتے۔ بلکہ حضرت علیؓ کے باپ ہونے کی وجہ سے کہ امام کا باپ بھی مؤمن ہوتا ہے اور بعض خالی تو ان کو نبی مانتے ہیں اور بے دھڑک ”علیہ السلام“ استعمال کرتے ہیں۔ خدا ایسے غلو اور شرک فی النبوت سے بچائے، آمین!

حضرت حسنؑ کی بیعت معاویہؓ

یقیناً حضرت حسنؑ نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کی تھی تو شیعہ سیدنا حسنؑ سے ابھی تک ناراض ہیں اور ان کے کسی بھی کمال و کردار پر کوئی خصوصی تقریب یا مجلس منعقد نہیں کرتے۔ ثبوت ملاحظہ ہو:

۱۔ کتاب احتجاج جلد ۲ ص ۴۷۱ میں روایت ہے کہ جب امام حسنؑ نے معاویہؓ کے ہاتھ پر سلح کر لی تو لوگ حاضر ہوئے اور انہوں نے معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر آپؑ کو ملامت کی۔ حضرت حسنؑ نے فرمایا: ”تم پر افسوس ہے، تم نہیں جانتے کہ میں نے تمہارے لیے کیا اچھا کام کیا۔ خدا کی قسم! جو میں نے کیا وہ میرے شیعوں کے لیے بہتر ہے۔“

... آیاندی دانید کہ هیچک از مانیتست مگر آنکہ ورگردن او بیعتی از خلیفہ جو
اے کہ در زمان اوست واقع می شود مگر قائم ما

کیا تم نہیں جانتے کہ قائم مہدی کے سوا ہم سب شیعہ امام اپنے اپنے زمانے کے خلیفہ جو کی بیعت اپنی گردن میں ڈالتے رہے ہیں۔ (جلاء العیون ص ۲۶۱ از باقر مجلسی، منتہی الآمال ج ۱ ص ۳۳۱ از عباس قمی)

۲۔ حضرت امیر معاویہؓ نے فوراً ان کی شرائط کو منظور کر لیا اس کے بعد انہوں نے (حضرت حسنؑ) اور ان کے ہمراہیوں نے بھی آکر بیعت کر لی۔ حضرت حسنؑ نے حضرت معاویہؓ سے کہا: ”آپؓ، حضرت حسینؑ سے اصرار نہ کریں، آپؓ کی بیعت کرنے کے مقابلہ میں ان کا اپنا فخر عزیز تر ہے۔“ یہ سن کر حضرت امیر معاویہؓ خاموش ہو گئے لیکن بعد میں پھر حضرت حسینؑ نے بھی حضرت امیر معاویہؓ سے بیعت کر لی۔ (تاریخ اسلام ج ۱ ص ۴۵۸ از اکبر شاہ نجیب آبادی)

جب حضرت حسنؑ نے حکومت حضرت معاویہؓ کو سونپ دی تو حضرت معاویہؓ نے چند شرائط پر کاربند رہنے کا تحریری عہد کیا۔ مختلف تاریخوں میں شرائط کی دفعات و تفصیلات میں اختلاف ہے۔ دنیوری کا بیان اس باب میں زیادہ مستند ہے اور قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق مصالحت کی دفعات مندرجہ

۱۔ کسی عراقی کو محض پرانی عداوت کی بناء پر نہ پکڑا جائے۔

۲۔ بلا استثناء سب کو امان دی جائے۔

۳۔ اہل عراق کی بدزبانیوں کو انگیز کیا جائے۔

۴۔ دارالبحر دکا پورا خراج حضرت حسنؑ کے لیے مخصوص کیا جائے۔

۵۔ حضرت حسینؑ کو دو لاکھ سالانہ دیے جائیں۔

۶۔ وظائف میں بنو ہاشم کو بنو امیہ پر ترجیح دی جائے۔

حضرت امیر معاویہؓ نے بلا کی ترمیم کے یہ تمام شرطیں منظور کر لیں اور اپنے قلم سے اقرار نامہ لکھ کر اس پر مہر کر کے اکابر شام کی شہادتیں لکھوا کر عبید اللہ بن عامر کے ذریعہ حضرت حسنؑ کے پاس بھجوادیا۔

(اخبار الطوال ص ۲۳۱، طبری بحوالہ تاریخ اسلام ندوی ج ۱ ص ۳۰۸)

شیعہ کی جلاء العیون ص ۲۵۴ اور منتہی الآمال ص ۲۳۰ پر ہے کہ حسنؑ بن علیؑ نے معاویہؓ بن ابوسفیانؓ کے ساتھ صلح کی ہے اور حسنؑ ان کا مقابلہ نہ کریں گے بشرطیکہ:

۱۔ وہ لوگوں کے درمیان کتابِ خدا، سنتِ رسول ﷺ اور سیرتِ خلفاء راشدینؓ کے مطابق حکومت کریں۔

۲۔ اپنے بعد کسی شخص کو امر خلافت کے لیے مقرر نہ کریں۔

۳۔ شام، عراق، حجاز، یمن کے لوگ جہاں بھی رہیں اس کی گرفت سے بے فکر رہیں۔

۴۔ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ اپنی جان و مال اور زن و اولاد سمیت محفوظ رہیں گے۔

ان شرائط پر حضرت معاویہؓ سے عہد و پیمان لیا گیا۔ (حضرت معاویہؓ ان شرائط پر کاربند رہے تبھی تو حضرت حسنؑ نے مقابلہ نہ کیا) ولی عہدی خود نہ کی تھی بعض عمال کے مشورے اور پھر سب کی تائید سے کی تاکہ جھگڑا نہ پیدا ہو۔

باغِ فدک کا مسئلہ

باغِ فدک کا معاملہ بھی مدت تک معرکہ الآراء رہا ہے۔ ایک گروہ (شیعہ) کا خیال ہے ”باغِ فدک خالص آنحضرت ﷺ کی جائیداد تھی کیونکہ اس پر چڑھائی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہاں کے لوگوں نے خود آپ ﷺ کے سپرد کر دیا تھا اور اس وجہ سے وہ اس آیت کے تحت میں داخل ہے:

وما افاء الله على رسوله منهم فما اوجفتم عليه من خيل ولا ركاب ولكن الله يسلط رسله على من يشاء والله على كل شيء قدير

جو کچھ خدا نے اپنے پیغمبر کو ان لوگوں سے دلویا تو تم لوگ اس پر اونٹ یا گھوڑے دوڑا کر نہیں گئے تھے، لیکن خدا اپنے پیغمبر کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

”اور جب وہ آنحضرت ﷺ کی مملوکہ خاص ٹھہری تو اس میں وراثت کا عام قاعدہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے، جاری ہوگا۔ اور آنحضرت ﷺ کے ورثاء اس کے مستحق ہوں گے، لیکن حضرت عمرؓ نے باوجود حضرت علیؓ کے طلب و تقاضا کے آلِ نبی ﷺ کو اس سے محروم رکھا۔“

یہ بحث اگرچہ، طرفین کے طبع آزمائیوں میں بہت بڑھ گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات نہایت مختصر تھی، اور اب جب کہ سیاستِ مدن کے اصول زیادہ صاف اور عام فہم ہو گئے ہیں، یہ مسئلہ اس قابل بھی نہیں رہا کہ بحث کے دائرہ میں لایا جائے۔ اصل یہ ہے کہ نبی، امام یا بادشاہ کے قبضہ میں جو مال یا جائیداد ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک **مملوکہ خاص** جس کے حاصل ہونے میں نبوت اور امامت و بادشاہت کے منصب کو کچھ دخل نہیں ہوتا مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام، زرہ بنا کر معاش حاصل کرتے تھے یا عالمگیرؒ قرآن لکھ کر بسر کرتے تھے۔ یہ آمدنی ان کی ذاتی آمدنی تھی اور اس پر ہر طرح کا ان کو اختیار تھا۔ دوسری **مملوکہ حکومت** ہے جیسا کہ

حضرت داؤد علیہ السلام کے مقبوضہ ممالک، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضے میں آئے۔

اس دوسری قسم میں وراثت نہیں جاری ہوتی بلکہ جو شخص پیغمبری، امامت یا بادشاہت کی حیثیت سے جانشین ہوتا ہے وہی اس کا مالک یا متولی ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ آج کل کے مذاق کے موافق بالکل ایک بدیہی بات ہے، مثلاً سلطان عبدالحمید خان کے بعد ان کے ممالک مقبوضہ یا انکی جاگیر خالصہ ان کے بیٹے، بھائی، ماں، بہن وغیرہ میں تقسیم نہیں ہوگی بلکہ جو تخت نشین ہوگا وہ اس پر قابض ہوگا۔

مذہبی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے ہر گروہ میں یہ قاعدہ ہمیشہ مستم رہا۔ مثلاً جو لوگ باغ فدک کو درجہ بدرجہ ائمہ اثناء عشرہ کا حق سمجھتے ہیں وہ بھی اس میں وراثت کا قاعدہ نہیں جاری کرتے۔ مثلاً حضرت علیؑ اپنے زمانے میں اس کے مالک ہوئے تو یہ نہیں ہوا کہ ان کی وفات کے بعد وراثت کا قاعدہ جاری ہوتا اور حسینؑ و عباسؑ و محمد بن حنفیہؑ و زینبؑ وغیرہ کو جو حضرت علیؑ کے وارث تھے، اس کا کچھ حصہ سہام کے پڑتہ سے ملتا، بلکہ صرف حضرت حسنؑ کے قبضہ میں آیا کیوں کہ امامت کی حیثیت سے وہی حضرت علیؑ کے جانشین تھے۔

غرض یہ عام اور مسلم قاعدہ ہے کہ جو جائیداد نبوت یا امامت یا بادشاہت کے منصب سے حاصل ہوتی ہے وہ **مملوکہ خاص** نہیں ہوتی۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ باغ فدک کیونکر حاصل ہوا تھا؟ اس کیفیت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب خیبر کی فتح سے واپس ہوئے تو محیصہ بن مسعود الانصاریؓ کو فدک والوں کے پاس تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا۔ فدک یہودیوں کے قبضہ میں تھا اور انکا سردار یوشع بن نون نامی ایک یہودی تھا۔ یہودیوں نے سلح کا پیغام بھیجا اور معاوضہ سلح میں آدھی زمین دینی منظور کی۔ **(فتوح البلدان، بلاذری، ذکر فدک)** اس وقت سے یہ باغ، اسلام کے قبضہ میں آیا۔

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی جائیداد آنحضرت ﷺ کی **مملوکہ خاص** کیوں کر ہو سکتی ہے۔ فدک کی ملکیت خاص کا دعویٰ اس بناء پر کیا جاتا ہے کہ وہ فوج کے ذریعہ سے فتح نہیں ہوا بلکہ اس آیت کا مصداق ہے جو کہ درج ذیل ہے:

فما اوجفتم عليه من خيل ولاركاب

لیکن کیا جو مالکِ سلح کے ذریعہ سے قبضہ میں آتے ہیں وہ امام یا بادشاہ کی ملکیت خاص قرار پاتے ہیں؟ عرب کے اور مقامات بھی اس طرح قبضہ میں آئے کہ ان پر چڑھائی نہیں کرنی پڑی، کیا ان کو کسی نے آنحضرت ﷺ کی ملک خاص سمجھا؟ البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ جب اور مقامات مفتوحہ کی نسبت کسی نے اس قسم کا کبھی خیال نہیں کیا تو فدک میں کیا خصوصیت تھی جس کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اور مفتوحہ زمینیں اعلانیہ وقف عام رہیں لیکن فدک کو آنحضرت ﷺ نے اپنے مصارف کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اس سے اس خیال کا موقع ملا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی جائیداد خاص ہے۔ اس خیال کی تائید زیادہ اس ہوئی کہ فدک پر لشکر کشی نہیں ہوئی تھی اور اس لیے اس پر اور لوگوں کو کسی قسم کا حق نہیں حاصل تھا لیکن یہ خیال دراصل صحیح نہیں۔ فدک کو بے شبہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ذاتی مصارف کے لیے خاص کر لیا تھا، لیکن کیونکر؟ اس کے متعلق تفصیلی روایتیں موجود ہیں:

فکان نصف فدک خالصا لرسول اللہ وکان یصرف مایاتیه منها الی ابناء

السبیل (فتوح البلدان)

یعنی آدھا فدک، خاص رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ آنحضرت ﷺ اس میں سے مسافر پر صرف کرتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے:

ان فدک کانت للنبی ﷺ فکان ینفق منها ویاکل ویعود علی فقراء بنی ہاشم و

یزوج ایمهم (فتوح البلدان)

یعنی فدک آں حضرت ﷺ کا تھا۔ آپ اس میں سے خرچ کرتے تھے اور فقراء بنی ہاشم کو دیتے تھے، اور ان کی بیواؤں کی شادی کرتے تھے۔

بخاری وغیرہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ سال بھر اپنا خرچ اس میں سے لیتے تھے۔ باقی

عام مسلمین کے مصالح میں دے دیتے تھے۔

ان روایتوں سے ظاہر ہے کہ فدک کا مملوکہ نبوت ہونا ایسا ہی تھا جیسا سلاطین کے لیے کوئی جائیداد خالصہ کر دی جاتی ہے۔ اس بناء پر باوجود مخصوص ہونے کے وقف کی حیثیت اس سے زائل نہیں ہوئی۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ بھی ان اصول سے واقف تھے؟ اور اسی بناء پر انہوں نے فدک میں وراثت نہیں جاری کی یا کہ یہ نکات بعد الوقوع ہیں؟

عراق اور شام کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کے مجمع عام میں جو تقریر کی تھی اس میں قرآن مجید کی اس آیت: **مَا آفَاءَ لِلَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ...** الخ سے استدلال کر کے صاف کہہ دیا تھا کہ مقامات مفتوحہ کسی خاص شخص کی ملک نہیں ہیں بلکہ وقف عام ہیں۔ البتہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے اس سے فدک وغیرہ کا آنحضرت ﷺ کی خاص جائیداد ہونا ثابت ہوتا ہے اور خود حضرت عمرؓ اس کے یہی معنی قرار دیتے تھے۔ آیت یہ ہے:

وَمَا آفَاءَ لِلَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أُوجِفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خِيَلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ

اور جو کچھ ان لوگوں سے (یعنی یہودی بنی نضیر) خدا نے اپنے پیغمبر کو دلوایا تو تم لوگ اس پر چڑھ کر نہیں گئے تھے، بلکہ خدا اپنے پیغمبروں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھ کر کہا تھا کہ:

فَكَانَتْ خَالِصَةً لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اور یہ واقعہ صحیح بخاری، باب الخمس، باب المغازی اور باب الميراث میں تفصیل موجود ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ اس آیت کی بناء پر فدک وغیرہ کو آنحضرت ﷺ کا خالصہ سمجھتے تھے لیکن

اسی قسم کا خالصہ جو ذاتی ملکیت نہیں ہوتا، جس طرح سلاطین کے مصارف کے لیے کوئی زمین خاص کر دی جاتی ہے کہ اس میں میراث کا عام قاعدہ نہیں جاری ہوتا بلکہ جو شخص جانشین سلطنت ہوتا ہے تنہا وہی ہو اس سے متمتع ہو سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے اس خیال کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے جب آیت مذکورہ بالا کی بناء پر فدک کو آنحضرت ﷺ کا خالصہ کہا تو ساتھ ہی یہ الفاظ فرمائے جیسا کہ صحیح بخاری، باب الخمس و باب المغازی میں مذکور ہے:

فكان رسول الله ينفق على اهله نفقة سنتهم من هذا المال ثم ياخذ ما بقى فيجعله مجعل مال الله فعمل رسول الله بذا لك حياته ثم توفي الله نبيه صلى الله عليه وسلم فقال ابو بكر انا ولي رسول الله فقبضها ابو بكر فعمل فيها بما عمل رسول الله ثم توفي الله ابا بكر فكنت انا ولي ابي بكر فقبضتها سنتين من اما رتي اعمل فيها بما عمل رسول الله صلى الله عليه وسلم و بما عمل فيها ابو بكر

آنحضرت ﷺ اس میں سے سال بھر کا خرچ لیتے تھے، باقی کو خدا کے مال کے طور پر خرچ کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے زندگی بھر اسی پر عمل کیا۔ پھر وفات پائی تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ میں ان کا جانشین ہوں پس اس پر قبضہ کیا اور اس طرح کارروائی کی جس طرح رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔ انہوں نے وفات پائی تو میں ابو بکرؓ کا جانشین ہوں، پس میں نے اس پر دو برس قبضہ رکھا اور وہی کارروائی کی جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔

اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ باوجود اس کے کہ فدک وغیرہ کو خالصہ سمجھتے تھے، تاہم آنحضرت ﷺ کی ذاتی جائیداد نہیں سمجھتے تھے (کہ جس میں وراثت جاری ہو) اور اس وجہ سے اس کے قبضہ کا

محقق صرف اس کو قرار دیتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کا جانشین ہو۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ اور خود اپنے قبضہ کی وجہ یہی بتائی۔

حضرت عمرؓ نے یہ تقریر اس وقت فرمائی تھی جب حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ ان کے پاس فدک کے دعویدار ہو کر آئے تھے اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اس میں وراثت کا قاعدہ نہیں جاری ہو سکتا۔
حاصل یہ کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک فدک وغیرہ آنحضرت ﷺ کے خالصہ بھی تھے اور وقف بھی تھے۔ چنانچہ عراق کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ نے اسی آیت کو جس سے آنحضرت ﷺ کا خالصہ ہونا پایا جاتا ہے پڑھ کر یہ الفاظ کہے:

فهذه عامة في القرى كلها

یعنی جو حکم اس آیت میں ہے وہ انہی مواضع یعنی فدک وغیرہ پر محدود نہیں بلکہ تمام آبادیوں کو شامل ہے۔
اصل یہ ہے کہ فدک کا دو جہتیں ہونا ہی تمام غلط فہمی کا منشاء تھا۔ چنانچہ حافظ ابن القیمؒ نے زاد المعاد جلد دوم صفحہ ۱۶۳ میں نہایت لطیف پیرایہ میں اس بات کو ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

فهو ملك يخالف حكم غيره من المالكين... وهذا النوع من الاموال هو القسم الذي وقع بعده فيه من النزاع ما وقع الى اليوم... ولولا اشكال امره عليهم لما طلبت فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم ميراثها من تركته و ظنت انه يورث عنه ما كان ملكا له كسائر المالكين وخفي عليها رضي الله عنها حقيقة الملك الذي ليس مما يورث عنه

ان واقعات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان مسائل کو جو ابتداء سے آج تک معرکہ الآراء رہے ہیں اور جن میں بڑے بڑے اکابر صحابہؓ کو اشتباہ ہوا، حضرت عمرؓ نے کس خوبی سے طے کیا کہ ایک طرف تو قرآن وحدیث کا صحیح محمل وہی ہو سکتا ہے اور دوسری طرف اصول سلطنت ونظام تمدن سے بالکل مطابقت رکھتا ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ (خلافت حضرت ابوبکرؓ)

یہ واقعہ بظاہر تعجب سے خالی نہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا تو فوراً خلافت کا نزاع پیدا ہو گیا اور اس بات کا بھی انتظار نہ کیا گیا کہ پہلے رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین سے فراغت حاصل کر لی جائے، کس کے قیاس میں آ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ انتقال فرمائیں اور جن لوگوں کو ان کے عشق و محبت کا دعویٰ ہو وہ ان کو بے گور و کفن چھوڑ کر چلے جائیں، اور اس بند و بست میں مصروف ہوں کہ مسند حکومت اوروں کے قبضے میں نہ آ جائے۔

تعجب پر تعجب یہ ہے کہ یہ فعل ان لوگوں (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) سے سرزد ہوا جو آسمان اسلام کے مہر و ماہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس فعل کی ناکواری اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آنحضرت ﷺ سے فطری تعلق تھا، حضرت علیؓ و خاندان بنی ہاشم، ان پر فطرتی تعلق کا پورا اثر ہوا اور اس وجہ سے ان کو آنحضرت ﷺ کے دروغم اور تجہیز و تکفین سے ان باتوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی۔

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ کتب حدیث و سیر سے بظاہر اسی قسم کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ، آنحضرت ﷺ کی تجہیز و تکفین چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ کو چلے گئے، یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے سقیفہ میں پہنچ کر خلافت کے باب میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور اس طرح ان کی کوششوں میں مصروف رہے کہ گویا ان پر کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے اپنی خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علیؓ سے بھی بزور منوانا چاہا۔ کو بنو ہاشم نے آسانی سے ان کی خلافت تسلیم نہیں کی لیکن اس بحث میں غور طلب جو باتیں ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کیا خلافت کا سوال، حضرت عمرؓ وغیرہ نے چھیڑا تھا؟

۲۔ کیا یہ لوگ خود اپنی خواہش سے سقیفہ بنی ساعدہ میں گئے تھے؟

۳۔ کیا حضرت علیؓ اور بنو ہاشم خلافت کی فکر سے بالکل فارغ تھے؟

۴۔ ایسی حالت میں جو کچھ حضرت عمرؓ وغیرہ نے کیا، وہ کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟

پہلی دو بحثوں کی نسبت ہم نہایت مستند کتاب، **مستند ابویعلیٰ** کی عبارت نقل کرتے ہیں، جس سے واقعہ کی کیفیت بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔

بینہما نحن فی منزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رجل ینادی من وراء الجدار ان اخرج الی یا ابن الخطاب فقلت الیک عنی فانا عنک مشاغبیل یعنی یا مر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال له قد حدث امر فان الانصار اجتمعوا فی سقیفة بنی ساعدة فادركوا هم ان یحدثوا امرایکون فیہ حرب فقلت لابی بکر انطلق

”حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے خانہ مبارک میں بیٹھے تھے کہ دفعتاً دیوار کے پیچھے سے ایک آدمی نے آواز دی کہ ابن الخطاب! ذرا باہر آؤ۔ میں نے کہا کہ چلو ہٹو، ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے بندو بست (تجہیز و تدفین) میں مشغول ہیں۔ اس نے کہا ایک حادثہ پیش آیا ہے یعنی انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس لیے جلد پہنچ کر ان کی خبر لو ایسا نہ ہو کہ انصار کچھ ایسی بات کہ انھیں جس سے لڑائی چھڑ جائے اس وقت میں نے ابو بکرؓ سے کہا کہ چلو۔“

اس سے ظاہر ہوگا کہ نہ حضرت عمرؓ وغیرہ نے خلافت کی بحث کو چھیڑا تھا نہ وہ اپنی خوشی سے سقیفہ بنی ساعدہ کو جانا چاہتے تھے۔

تیسری بحث کی یہ کیفیت ہے کہ اس وقت جمعیت اسلامی تین گروہوں میں تقسیم کی جاسکتی تھی۔ بنو ہاشم، جس میں حضرت علیؓ شامل تھے۔ مہاجرین، جن کے رئیس و انسر حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ تھے۔ انصار، جن کے

شیخ حضرت سعد بن عبادہؓ تھے۔ ان تینوں میں سے ایک گروہ بھی خلافت کے خیال سے خالی نہ تھا۔ انصار نے تو اعلانیہ اپنا ارادہ اظہار کر دیا تھا۔ بنو ہاشم کے خیالات ذیل کی روایت سے معلوم ہوں گے۔

”آنحضرت ﷺ کی وفات کے دن حضرت علیؓ مکان سے باہر نکلے، لوگوں نے ان سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج کیسا ہے؟ چوں کہ آنحضرت ﷺ کی ظاہری حالت بالکل سنبھل گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے کہا ”خدا کے فضل سے آپ ﷺ اچھے ہو گئے۔“ حضرت عباسؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ خدا کی قسم تم تین دن کے بعد غلامی کرو گے، میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ عنقریب اس مرض میں وفات پائیں گے، کیوں کہ مجھ کو اس کا تجربہ ہے کہ خاندان عبدالمطلب کا چہرہ موت کے قریب کس طرح متغیر ہو جاتا ہے، آؤ چلو، رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیں کہ آپ ﷺ کے بعد یہ منصب (خلافت) کس کو حاصل ہوگا؟ اگر ہم اس کے مستحق ہیں تو رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے وصیت فرمائیں گے“ حضرت علیؓ نے فرمایا ”میں نہ پوچھوں گا کیوں کہ اگر پوچھنے پر آنحضرت ﷺ نے انکار کر دیا تو پھر آئندہ کوئی امید نہیں رہے گی۔“ (صحیح بخاری، باب مرض النبی ﷺ مع فتح الباری)

اس روایت سے حضرت عباسؓ کا خیال تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کو آنحضرت ﷺ کی وفات کا اس وقت تک یقین نہ تھا اس لیے انہوں نے کوئی تحریک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے انتخاب کیے جانے پر بھروسہ نہ تھا۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ کے گھر میں ایک مجمع ہوا جس میں تمام بنو ہاشم اور ان کے اتباع شریک تھے اور حضرت علیؓ ان کے پیش رو تھے۔

صحیح بخاری کتاب الحدود باب رجم الجہلی میں حضرت عمرؓ کی زبانی روایت ہے:

کان من خبرنا حين توفي الله نبيه ان الانصار خالفونا واجتمعوا باسره في سقيفة

بنی ساعدة وخالف عنا علی والزبیر ومن معهما واجتمع المهاجرون الی ابی بکر

ہماری سرگزشت یہ ہے کہ جب خدا نے اپنے پیغمبر ﷺ کو اٹھا لیا تو انصار نے قاطبہ ہماری مخالفت کی اور سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور علیؑ وزیرؑ اور ان کے ساتھیوں نے مخالفت کی اور مہاجرین ابو بکرؓ کے پاس جمع ہوئے۔ یہ تقریر حضرت عمرؓ نے ایک بہت بڑے مجمع عام میں کی تھی جس میں سینکڑوں صحابہؓ موجود تھے۔ اس لیے اس بات کا گمان نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کوئی امر خلاف واقع کہا ہو ورنہ لوگ ان کو وہیں ٹوکتے۔ امام مالکؒ کی روایت میں یہ واقعہ اور صاف ہو گیا، اس کے یہ الفاظ ہیں:

وان علیا والزبیر ومن کان معهما تخلفوا فی بیت فاطمة بنت رسول اللہ

اور علیؑ وزیرؑ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے، وہ حضرت فاطمہؓ کے گھر میں ہم سے الگ ہو کر جمع ہوئے۔ (فتح الباری شرح حدیث مذکور)

وتخلف علی والزبیر واخترط الزبیر سیفہ وقال لا اغمده حتی یبایع علی

اور حضرت علیؑ وزیرؑ نے علیحدگی اختیار کی اور وزیرؑ نے تلوار میان سے کھینچ لی اور کہا کہ جب تک علیؑ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی جائے میں تلوار کو میان میں نہ ڈالوں گا۔ (تاریخ طبری ص ۱۸۲۰)

ان تمام روایتوں سے صاف یہ نتائج نکلتے ہیں کہ:

۱۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی خلافت کے باب میں تین گروہ ہو گئے۔ انصار، مہاجرین اور

بنو ہاشم۔

۲۔ مہاجرین حضرت ابو بکرؓ اور بنو ہاشم حضرت علیؑ کے ساتھ تھے۔

۳۔ جس طرح حضرت عمرؓ وغیرہ آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر سقیفہ کو چلے گئے تھے، حضرت علیؓ بھی آنحضرت ﷺ کے پاس سے چلے آئے تھے اور حضرت فاطمہؓ کے گھر میں بنو ہاشم کا مجمع ہوا تھا۔ سقیفہ میں حضرت علیؓ کا نہ جانا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے غم و الم میں مصروف تھے اور ان کو ایسے پر درد موقع پر خلافت کا خیال نہیں آ سکا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سقیفہ میں مہاجرین و انصار جمع تھے اور ان دونوں گروہوں میں سے کوئی حضرت علیؓ کے دعویٰ کی تائید نہ کرنا کیوں کہ مہاجرین حضرت ابو بکرؓ کو پیشوا تسلیم کرتے تھے اور انصار کے رئیس حضرت سعد بن عبادہؓ تھے۔

اخیر بحث یہ ہے کہ جو کچھ ہو وہ بے جا تھا یا بجا؟ اس کو ہر شخص جو ذرا بھی اصول تمدن سے واقفیت رکھتا ہو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جس وقت وفات فرمائی مدینہ منورہ منافقوں سے بھرا ہوا پڑا تھا جو مدت سے اس بات کے منتظر تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ اٹھ جائے تو اسلام کو پامال کر دیں۔ اس نازک وقت میں آیا یہ ضروری تھا کہ لوگ جزع و فزع اور گریہ و زاری میں مصروف رہیں یا یہ کہ فوراً خلافت کا انتظام کر لیا جائے اور ایک منظم حالت قائم ہو جائے۔ انصار نے اپنی طرف سے خلافت کی بحث چھیڑ کر حالت کو اور نازک کر دیا کیونکہ قریش جو انصار کو اس قدر حقیر سمجھتے تھے کہ جنگ بدر میں جب انصار ان کے مقابلے میں نکلے تو عتبہ نے آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے کہا کہ ”محمد ﷺ! ہم ناجنسوں سے نہیں لڑ سکتے“ کسی طرح انصار کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر سکتے تھے۔ قریش پر کیا موقوف ہے، تمام عرب کو انصار کی متابعت سے انکار ہوتا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے سقیفہ میں جو خطبہ دیا اس میں صاف اس خیال کو ظاہر کیا اور کہا:

وان العرب لاتعرف هذا الامر الا لالهذالحی من قریش

اس کے علاوہ انصار میں خود دو گروہ تھے اوس اور خزرج۔ اور ان میں باہم اتفاق نہ تھا اس حالت میں ضروری تھا کہ انصار کے دعویٰ خلافت کو دبا دیا جائے اور کوئی لائق شخص فوراً انتخاب کر لیا جائے۔ مجمع میں جو لوگ موجود

تھے ان میں سب سے با اثر بزرگ اور معمر حضرت ابو بکرؓ تھے اور فوراً ان کا انتخاب بھی ہو جاتا۔ لیکن لوگ انصار کی بحث و نزاع میں پھنس گئے تھے۔ اور بحث طول پکڑ کر قریب تھا کہ تلواریں میان سے نکل آئیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ رنگ دیکھ کر دفعتاً حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا کہ ”سب سے پہلے میں بیعت کرتا ہوں“۔ ساتھ ہی حضرت عثمانؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ نے بھی ہاتھ بڑھائے۔ (ابن الماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں لکھا ہے کہ اول صرف پانچ شخصوں نے بیعت کی تھی) اور پھر عام خلقت ٹوٹ پڑی۔ اس کارروائی سے ایک اٹھتا ہوا طوفان رک گیا اور لوگ مطمئن ہو کر کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ صرف بنو ہاشم اپنے ادعا پر رکے رہے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں وقتاً فوقتاً جمع ہو کر مشورے کرتے رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بزوران سے بیعت لینا چاہی لیکن بنو ہاشم حضرت علیؓ کے سوا کسی کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور طبری نے تاریخ کبیر میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا: یا بنت رسول اللہ ﷺ! خدا کی قسم آپؐ ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں تاہم اگر آپ کے یہاں لوگ اس طرح مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا۔“

اگرچہ سند کے اعتبار سے اس روایت پر ہم اپنا اعتبار ظاہر نہیں کر سکتے کیوں کہ اس روایت کے رواۃ کا حال ہم کو معلوم نہیں ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نازک وقت میں حضرت عمرؓ نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں انہی نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا۔ بنو ہاشم اگر اپنی بات پر قائم رہتے تو اسی وقت جمعیت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا۔ اور وہیں خانہ جنگیاں برپا ہو جاتیں جو آگے چل کر حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم میں واقع ہوئیں۔

حضرت عمرؓ اور حضرت ام کلثومؓ بنت علیؓ کا نکاح

اخیر عمر میں حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ خاندانِ نبوت سے تعلق پیدا کریں جو مزید شرف اور برکت کا سبب تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے حضرت ام کلثومؓ کیلئے درخواست کی، جناب مدوح نے پہلے ام کلثومؓ کی صغریٰ کے سبب سے انکار کیا لیکن جب حضرت عمرؓ نے زیادہ تمنا ظاہر کی اور کہا کہ اس سے مجھ کو حصولِ شرف مقصود ہے تو جناب علیؓ نے منظور فرمایا اور کچھ عرصے میں ۴۰ ہزار مہر پر نکاح ہوا۔

حضرت ام کلثومؓ بنت فاطمہؓ کی تزویج کا واقعہ تمام معتمد مؤرخوں نے بتفصیل لکھا ہے۔ طبری نے تاریخ کبیر میں، ابن حبان نے کتاب الثقات میں، ابن قتیبہ نے معارف میں، ابن اثیر نے کامل میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ ام کلثومؓ بنت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت عمرؓ کی زوجہ تھیں۔ ایک دوسری ام کلثوم بھی ان کی زوجہ تھیں لیکن ان دونوں میں مؤرخوں نے صاف تفریق کی ہے۔ علامہ طبری و ابن حبان و ابن قتیبہ سے بڑھ کر تاریخی واقعات کے لیے اور کیا سند ہو سکتی ہے۔ ان میں سے خاص عبارتیں اس موقع پر نقل کی جاتی ہیں۔ **ثقات ابن حبان، ذکر خلائفہ عمرؓ واقعات کچھ** میں مذکور ہے کہ:

ثم تزوج عمرام کلثوم بنت علی ابن ابی طالب وہی من فاطمہ و دخل بها فی شہر ذی القعدہ

معارف ابن قتیبہ، ذکر اولاد عمرؓ میں ہے:

وفاطمہ وزید وامام کلثوم بنت علی بن ابی طالب من فاطمہ بنت

رسول اللہ ﷺ

اسد الغابہ فی احوال الصحابہ لابن اثیر میں جہاں حضرت ام کلثومؓ کا حال لکھا ہے تفصیل کے ساتھ ان کی تزویج کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی طرح طبری نے بھی جا بجا تصریح کی ہے جس کو ہم تطویل کے خوف سے قلم انداز

کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صحیح بخاری میں ایک ضمنی موقع پر حضرت ام کلثومؓ کا ذکر آگیا ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ عورتوں کو چادریں تقسیم کیں۔ ایک بچ رہی۔ اس کی نسبت ان کو تر دتھا کہ کس کو دی جائے۔ ایک شخص نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

یا امیر المؤمنین اعط هذا بنت رسول الله ﷺ التي عندک یریدون ام کلثومؓ

(صحیح بخاری باب الجہاد، مطبوعہ میرٹھ ص ۴۰۳)

لہذا، اس میں صاف تصریح ہے کہ حضرت ام کلثومؓ جو کہ حضرت عمرؓ کی زوجہ تھیں، خاندانِ نبوت سے تھیں۔ حضرت عمرؓ کی اور بیویاں بھی تھیں، یعنی ام حکیم بنت حارث بن ہشام الخزومی، لکیمہ بنت یمنہ، نائلہ بنت زید بن عمرو بن نفیل۔ نائلہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں، ان کا نکاح پہلے حضرت ابوبکرؓ کے فرزند عبداللہؓ سے ہوا تھا، عبداللہؓ غزوہ طائف میں شہید ہو گئے۔ نائلہؓ نے ان کا نہایت درد انگیز مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

فالیت لاتنفک عینی حزینۃ علیک ولا ینفک جلدی اغبرا

میں نے قسم کھائی ہے کہ میری آنکھ ہمیشہ تیرے اوپر ٹپکے گی اور بدنِ خاک آلودہ رہے گا۔

حضرت عمرؓ کے اولاد کثرت سے ہوئی جن میں سے حضرت حفصہؓ اس لیے زیادہ ممتاز ہیں کہ وہ ازواجِ مطہرات میں سے ہیں۔ ان کا نکاح پہلی حدیس بن خذافہؓ کے ساتھ ہوا تھا جو مہاجرین صحابہؓ میں سے تھے۔ حدیس جب غزوہ احد میں شہید ہوئے تو وہ ۳ھ میں رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اور بہت سے صحابہؓ نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ۴۵ھ میں ۶۳ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔

واقعہ قرطاس (کاغذ قلم)

بیماری کا بڑا مشہور واقعہ قرطاس کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے وفات سے تین روز پہلے قلم اور دوات طلب کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھوں گا کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہو گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آنحضرت کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔ حاضرین میں سے بعضوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ یہی باتیں کر رہے ہیں (نعوذ باللہ)۔ (روایت میں ہجر کا لفظ ہے جس کے معنی ہڈیاں کے ہیں)

یہ واقعہ بظاہر تعجب انگیز ہے۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ اس زیادہ اور کیا گستاخی اور سرکشی ہوگی کہ جناب رسول اللہ ﷺ بستر مرگ پر اور امت کے درد و غم خواری کے لحاظ سے فرماتے ہیں ”کہ لاؤ میں ایک ہدایت نامہ لکھ دوں جو تم کو گمراہی سے محفوظ رکھے“۔ یہ ظاہر ہے کہ گمراہی سے بچانے کے لیے جو ہدایت ہوگی وہ منصب نبوت کے لحاظ سے ہوگی اور اس لیے اس میں سہو و خطا کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ باوجود اس کہ حضرت عمرؓ بے پرواہی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ ضرورت نہیں ہم کو قرآن کافی ہے ”طرحہ یہ کہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ ہی نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کو ہڈیاں سے تعبیر کیا تھا“ (نعوذ باللہ)۔

یہ اعتراض ایک مدت سے چلا آ رہا ہے اور دو مختلف گروہوں نے اس پر بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں۔ لیکن چونکہ اس بحث میں غیر متعلق باتیں چھڑ گئیں اور اصولِ درایت سے کسی نے کام نہیں لیا اس لیے اصل مسئلہ نامفصل رہا اور عجیب عجیب بے کار بحثیں پیدا ہو گئیں۔ یہاں تک کہ یہ مسئلہ چھیڑا گیا کہ پیغمبر ﷺ سے ہڈیاں ہونا ممکن ہے کیوں کہ ہڈیاں انسانی عوارض میں ہے اور آنحضرت ﷺ عوارض انسانی سے بری نہ تھے۔

یہاں دراصل یہ امر غور طلب ہے کہ جو واقعہ جس طریقے سے روایتوں میں منقول ہے اس سے کسی امر پر استناد ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس بحث کے لیے پہلے واقعات ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

۱۔ آنحضرت ﷺ کم و بیش ۱۳ دن تک بیمار رہے۔

۲۔ کاغذ و قلم طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بتصریح مذکور ہے

اور چونکہ آنحضرت ﷺ نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اس لیے اس واقعہ کے بعد آنحضرت ﷺ ۴ دن تک زندہ رہے۔

۳۔ اس تمام مدت بیماری میں آنحضرت ﷺ کی نسبت، اور کوئی واقعہ اختلالِ حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں۔

۴۔ اس واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہؓ موجود تھے لیکن یہ حدیث باوجود اس کے بہت سے طریقوں سے مروی ہے (چنانچہ صرف صحیح بخاری میں ۷ طریقوں سے مذکور ہے) با ایں ہمہ بجز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی عمر اس وقت صرف ۱۳، ۱۴ برس کی تھی۔

۶۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا۔

۷۔ تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے کاغذ قلم مانگا تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ پہلی ہوئی باتیں کر رہے ہیں ۸۔

۱۔ بخاری باب کتابۃ العلم میں جو حدیث مذکور ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اس واقعہ میں موجود تھے۔ اس لیے محدثین نے اس پر بحث کی ہے اور بہ دلائل قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ موجود نہ تھے۔ تفصیل: فتح الباری باب کتابۃ العلم

۲۔ علامہ قرطبی نے یہ تاویل کی ہے اور اس پر ان کو ماز ہے کہ لوگوں نے یہ لفظ انکار اور استعجاب کے طور پر کہا تھا یعنی یہ کہ آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے خدا نخواستہ آنحضرت ﷺ کا قول ہدیان تو نہیں کہ اس پر لحاظ نہ کیا جائے، یہ تاویل لگتی ہوئی ہے۔ لیکن بخاری و مسلم کی بعض روایتوں میں ایسے صاف الفاظ ہیں جن میں اس تاویل کا احتمال نہیں مثلاً

ہجر ہجر (دور نہ) یا اَنْ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَهْجُرُ (صحیح مسلم)

اب سب سے پہلے یہ امر لحاظ کے قابل ہے کہ جب اور کوئی واقعہ یا قرینہ آنحضرت ﷺ کے اختلالِ حواس کا کہیں کسی روایت میں مذکور نہیں، تو صرف اس قدر کہنے سے کہ ”قلم دوات لاؤ“ لوگوں کو ہذیان کا خیال کیونکر پیدا ہو سکتا تھا؟ فرض کر لو کہ انبیاء علیہم السلام سے ہذیان سرزد ہو سکتا ہے لیکن اس کے یہ تو معنی نہیں کہ وہ معمولی بات بھی کہیں تو ہذیان سمجھی جائے۔ ایک پیغمبر ﷺ کا وفات کے قریب یہ کہنا کہ ”قلم دوات لاؤ میں ایسی چیز لکھ دوں کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہو“ اس میں ہذیان کی کیا بات ہے؟

یہ روایت اگر خواہ مخواہ صحیح سمجھی جائے تب بھی اس قدر بہر حال تسلیم کرنا ہوگا کہ راوی نے روایت میں وہ واقعات چھوڑ دیے ہیں جن سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرت ﷺ ہوش میں نہیں ہیں اور بے ہوشی کی حالت میں قلم دوات طلب فرما رہے ہیں۔ پس ایسی روایت سے جس میں کہ راوی نے واقعہ کی نہایت ضروری خصوصیات چھوڑ دیں، کسی واقعہ پر کیونکر استدلال ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ جب ان امور کا لحاظ کیا جائے کہ اتنے بڑے عظیم الشان واقعہ میں تمام صحابہؓ میں سے صرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اس کے راوی ہیں۔ اور یہ کہ ان کی عمر اس وقت ۱۳-۱۴ برس کی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود واقعہ کے وقت موجود نہ تھے۔ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس روایت کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے، ممکن ہے کہ کسی کوتاہ نظر پر یہ امر گراں گزرے کہ بخاری اور مسلم کی حدیث پر شبہ کیا جائے لیکن اس کو سمجھنا چاہیے کہ بخاری اور مسلم کے کسی راوی کی نسبت یہ شبہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا، اس کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہذیان اور حضرت عمرؓ کی نسبت گستاخی کا الزام لگایا جائے۔

غرض آنحضرت ﷺ اس واقعہ کے بعد چار دن تک زندہ رہے اور اس اثنا میں وقفہ وقفہ بہت سی ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں، عین وفات کے دن آپ ﷺ کی حالت اس قدر سنبھل گئی تھی کہ لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی بالکل صحت کا گمان ہو گیا۔

۱۔ ہمارے نکتہ نبون نے یہ مضمون آفرینی کی ہے کہ چوں کہ رسول اللہ ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے اس لیے آپ کا یہ فرمانا ”کہ میں لکھ دوں“ ہذیان کا قرینہ تھا لیکن ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ لکھنے کے معنی لکھوانے کے بھی آتے ہیں اور یہ مجازِ اُشائع اور ذائع ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ اسی خیال سے اپنے مکان کو جو مدینہ منورہ سے دو میل پر تھا واپس چلے گئے ۲

لیکن حضرت عمرؓ وفات کے وقت تک موجود رہے۔ آنحضرت ﷺ نے ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ دوشنبہ کے دن دوپہر کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں انتقال کیا اور سہ شنبہ کو دوپہر ڈھلنے پر مدفون ہوئے۔ جماعت اسلام کو آپ ﷺ کی وفات سے جو صدمہ ہوا اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ عام روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اس قدر خود رفتہ ہوئے کہ مسجد نبوی ﷺ میں جا کر اعلان کیا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرت ﷺ نے وفات پائی اس کو قتل کر ڈالوں گا، لیکن اور قرآن اس روایت کی تصدیق نہیں کرتے۔

ہمارے نزدیک چونکہ مدینے میں کثرت سے منافقین کا گروہ موجود تھا جو فتنہ پردازی کے لیے آنحضرت ﷺ کی وفات کا منظر تھا، اس لیے حضرت عمرؓ نے مصلحتاً اس خبر کے پھیلنے کو روکا ہوگا اسی واقعہ نے روایتوں کے تغیرات سے مختلف صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں جو ہمارے اس قیاس سے مطابق نہیں ہو سکتیں۔

حضرت علیؑ نے حضرت عمرؓ کا جنازہ پڑھا

حضرت علیؑ، وفاتِ عمرؓ کے وقت مدینہ میں تھے اور اپنے داماد کا جنازہ بھی پڑھا۔ معتبر ثبوت یہ ہے:

فلما مات عمر رضی اللہ عنہ و احضرت جنازته تبادر ایھا علی و عثمان رضی

اللہ عنہما ایھما یصلی علیہ فقال لھما عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ

لستما من ہذا فی شئ انما ہذا لی صہیب رضی اللہ عنہ الذی امرہ

عمر رضی اللہ عنہ ان یصلی بالناس فتقدم صہیب رضی اللہ عنہ فصلی علیہ

”جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور جنازہ حاضر ہو گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہم اور حضرت عثمان رضی

اللہ عنہم جنازہ پڑھانے کے لیے لپکے و عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم نے کہا تم دونوں نہیں پڑھا سکتے یہ صرف

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا حق ہے جسے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے (بطور وصیت) حکم دیا ہے کہ وہ نماز

پڑھائے چنانچہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی۔“ (البدایہ ج ۷ ص ۱۴۵، بیروت)

لہذا حضرت علیؑ، اپنے داماد حضرت عمرؓ کے جنازہ سے محروم نہ رہے بلکہ خوب خراج عقیدت

بھی پیش کیا۔ بخاری ج ۱ ص ۵۲۰، مسلم کتاب المناقب میں ہے:

”حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا جنازہ رکھا ہوا تھا لوگ اسکو گھیرے ہوئے تھے۔

دعائیں دیتے اور صلوٰۃ بھیجتے تھے، میں بھی ان میں تھا۔ مجھے ایک شخص نے اچانک ڈرا دیا جب اس نے میرا

کندھا پکڑا تو وہ حضرت علیؑ تھے جو حضرت عمرؓ پر دعائے رحمت بھیجتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ نے اپنے بعد

ایسا کوئی شخص نہیں چھوڑا جو آپ جیسے اعمال لے کر اپنے اللہ سے ملے اور مجھے سب سے زیادہ پسند ہو (یعنی آپؑ

کے بعد کوئی اور آپؑ سے افضل نہیں) اللہ کی قسم! میں یقیناً یہ گمان رکھتا تھا کہ اللہ آپؑ کو اپنے دوستیوں کے

ساتھ (قبروں میں اور جنت میں) اکٹھا کرے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بہت دفعہ حضور ﷺ سے سن رکھا

ہے، آپ ﷺ فرماتے تھے میں چلا اور ابو بکرؓ و عمرؓ چلے، میں داخل ہوا اور ابو بکرؓ و عمرؓ داخل ہوئے، میں نکلا اور

ابو بکرؓ و عمرؓ نکلے۔ (یعنی نبیؐ سے غیر مخصوص افعال عامہ میں شیخینؓ کی حضور ﷺ کے ساتھ کمال شرکت تھی) تو اب

برزخ میں بھی شریک رہیں گے۔ گویا حضرت علیؑ نے ہی حضور ﷺ کے ساتھ مدفن کا مشورہ دیا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم

مودودی صاحب نے اپنی کتاب ”خلافت و ملوکیت“ میں ”قانون کی بالائری کا خاتمہ“ کے عنوان کے تحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ:

”ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے انکے تمام کورنر، خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبوی ﷺ میں منبر رسول ﷺ پر عین روضہ نبوی ﷺ کے سامنے حضور ﷺ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے، کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف ہے اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے آ کر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبہ جمعہ میں سب علی کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی **ان الله يامر بالعدل والاحسان... الخ**۔“ ﴿ص ۱۷۷﴾

مودودی صاحب نے اس عبارت میں تین دعوے کیے ہیں، ایک یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خود سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، دوسرا یہ کہ ان کے تمام کورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرا یہ کہ یہ کورنر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ اب تینوں دعوؤں کا اصل مآخذ میں مطالعہ کیجیے:

جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے سو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس ”مکروہ بدعت“ کو منسوب کرنے کے لیے انہوں نے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کیے ہیں۔ ﴿طبری ج ۴ ص ۱۸۸، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۲، ج ۴ ص ۱۵۲، البدایہ ج ۹ ص ۸۰﴾ ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالہ کو صرف مذکورہ صفحات ہی پر نہیں بلکہ ان کے آس پاس بھی بنظر غائر دیکھا، ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ کہیں نہیں ملا کہ حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ ”خود“ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر برسرِ منبر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے لیکن چونکہ مودودی صاحب نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ اس ”انسانی اخلاق کے خلاف“ فعل کا ارتکاب وہ ”خود“ کیا کرتے تھے۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ شاید مودودی صاحب نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھ لی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں، چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے لیکن یقین فرمائیے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی، پھر بعض ان تو ارتح کی طرف بھی رجوع کیا جن کے بارے میں مودودی صاحب کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے۔ مثلاً مسعودی کی مروج الذهب، لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی۔

اس کے برعکس اس جستجو کے دوران ایسی متعدد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کے باوجود ان کا کس قدر احترام کرتے تھے؟ ان میں چند روایات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

لما جاء خبر قتل علي رضي الله عنه الى معاوية رضي الله عنه جعل يبكي
فقال له امراته اتبكيه وقد قاتلته فقال وبك انك لا تدريين ما فقد الناس
من الفضل والفقه والعلم

”جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ رونے لگے۔ ان کی اہلیہ نے ان سے کہا کہ آپ اب ان کو روتے ہیں حالانکہ زندگی میں ان سے لڑ چکے ہیں؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ آج لوگ کتنے علم و فضل اور فقہ سے محروم ہو گئے۔“ ﴿البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۱۳۰﴾

یہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے یہ اعتراض تو کیا کہ اب آپ انہیں کیوں روتے ہیں جب کہ زندگی میں ان سے لڑتے رہے لیکن یہ نہیں کہا کہ زندگی میں تو آپ ان پر سب و شتم کیا کرتے تھے، اب

ان پر کیوں روتے ہیں؟

۲۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بسر بن ارطاة رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ برا بھلا کہا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس پر انہیں تو بیخ کرتے ہوئے فرمایا:

تشتتم علیا وهو جدہ

”تم علی رضی اللہ عنہ کو گالی دیتے ہو حالانکہ وہ ان کے دادا ہیں۔“ ﴿الطبری، ج ۴، ص ۲۴۸، مطبعة الاستقامة بالقاهرة ۱۳۵۸ھ۔ الکامل لابن اثیر، ج ۴، ص ۵﴾

۳۔ علامہ ابن اثیر جزیریؒ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا جو آخری خطبہ نقل کیا ہے، اس میں ان کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ:

لن یاتیکم من بعدی الا من انا خیر منه کما ان من قبلی کان خیر امتی

”میرے بعد تمہارے پاس (جو خلیفہ) بھی آئے گا، میں اس سے بہتر ہوں گا، جس طرح مجھ سے پہلے جتنے (خلفاء) تھے مجھ سے بہتر تھے۔“ ﴿الکامل لابن اثیر، ج ۴، ص ۲﴾

۴۔ علامہ ابن عبد البرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے اصرار کے ساتھ ضرار صدائی سے کہا کہ: ”میرے سامنے علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف بیان کرو۔“ ضرار صدائی نے بڑے بلیغ الفاظ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی تعریفیں کیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سنتے رہے اور آخر میں رو پڑے، پھر فرمایا:

رحم الله بالحسن کان والله کذا لک

”اللہ ابو الحسن (علی رضی اللہ عنہ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔“ ﴿الاستیعاب تحت الاصابہ، ج ۳، ص ۴۳، ۴۴، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ ۱۹۳۰ء﴾

نیز حافظ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مختلف فقہی مسائل میں حضرت علی رضی اللہ

عنه سے خط و کتابت کے ذریعے معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

ذهب الفقہ والعلم بموت ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ

”ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی موت سے فقہ اور علم رخصت ہو گئے۔“ ﴿الاستیعاب تحت الاصابہ،

ص ۴۵، ج ۳، ذکر سیدنا علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب﴾

غرض اس جھگڑے کے دوران ہمیں اس قسم کی تو کئی روایتیں ملیں، لیکن کوئی ایک روایت بھی ایسی نہ مل سکی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) خطبوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام کس بنیاد پر کس دل سے عائد کیا ہے؟ پھر دوسرا دعویٰ انہوں نے یہ کیا ہے کہ ”ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔“

ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ اس وقت تو ثابت ہو سکتا ہے جب وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ”تمام گورنروں“ کی ایک فہرست جمع فرما کر ہر ایک گورنر کے بارے میں یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں سے ہر ایک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دی تھیں، نیز اس بات کا بھی ثبوت ان کے پاس ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرو۔

لیکن اپنے اس الزام کی تائید میں جو حوالے مودودی صاحب نے پیش کیے ہیں ہم نے ان کی طرف رجوع کیا تو ان میں سے ایک بات بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکی۔ اول تو یہ سمجھ لیجیے کہ مودودی صاحب کے دیے ہوئے پانچ حوالوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے صرف دو گورنروں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کیا کرتے تھے، ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے مروان بن الحکم، (طبری، ص ۱۸۸، ج ۴ اور کمال ابن اثیر، ص ۲۳۲، ج ۳) کا حوالہ مودودی صاحب نے حضرت مغیرہ بن

شعبہ رضی اللہ عنہ سے متعلق دیا ہے اور **البدایہ، ص ۲۵۹، ج ۸** کا حوالہ مروان بن الحکم سے متعلق ہے۔ رہ گیا **البدایہ، ص ۸۰، ج ۹** کا حوالہ سو اس میں حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف الثقفی کا ذکر ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نہیں بلکہ ان کے بہت بعد ولید بن عبد الملک کا گورنر تھا۔ اسی طرح **ابن اثیر، ص ۱۵۲، ج ۴** بنو امیہ کے خلفاء کا عمومی تذکرہ ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے کسی گورنر کا نہیں)۔ اگر ان روایات کو تھوڑی دیر کے لیے درست مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دو گورنروں پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ اس سے آخر یہ کیسے لازم آگیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے **”تمام گورنر“** خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایسا کیا کرتے تھے۔ یہ **”تمام گورنر“** کا الزام تو ایسا ہے کہ اسے شاید کسی موضوع روایتوں کے مجموعے سے بھی ثابت نہ کیا جاسکے۔

اس کے بعد اب ان دو روایتوں کی حقیقت بھی جان لیجیے جن میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور مروان بن الحکم کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔

پہلی روایت اصلاً علامہ **ابن جریر طبری** نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کی ہے اور انہیں سے نقل کر کے **ابن اثیر جزری** نے اپنی **تاریخ الکامل** میں اسے درج کر دیا ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قال هشام بن محمد عن أبي مخنف عن المجالد بن سعيد والصقعب بن زهير و فضيل بن خديج والحسين بن عقبة المرادي قال كل قد حدثني بعض هذا الحديث فاجتمع حديثهم فيما سقت من حديث حجر بن عدي الكندي واصحابه ان معاوية رضي الله عنه بن ابي سفيان رضي الله عنه لما ولي المغيرة بن شعبه رضي الله عنه في جمادى سنة ٤١ دعاه فحمد الله وثنى عليه ثم قال اما بعد..وقد اردت ايصاك باشياء كثيرة فانا تاركها اعتماداً على بصرک بما يرضيني وسعد سلطاني ويصلح به رعيتي ولست تاركاً ايصاءك بفصلة

لَا تَقْدَمُ عَنْ شَتَمِ عَلَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَذَمِّهِ وَالْتِرْحَمِ عَلَى عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ
وَالِاسْتِغْفَارِ لَهُ وَالْعَيْبِ عَلَى أَصْحَابِ عَلَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَالْإِقْصَاءِ لَهُمْ وَتَرْكِ
الِاسْتِمَاعِ مِنْهُمْ.. قَالَ أَبُو مُخَنَفٍ قَالَ الصَّقْعَبِ بْنِ زُهَيْرٍ سَمِعْتُ الشَّعْبِيَّ
يَقُولُ.. قَالَ وَأَقَامَ الْمَغِيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى الْكُوفَةِ عَامِلًا لِمَعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ
عَنْهُ سَبْعَ سَنِينَ وَاشْهَرًا وَهُوَ مِنْ أَحْسَنِ شَيْئِي سِيرَةً وَاشَدَّهُ حُبًّا لِلْعَافِيَةِ غَيْرِ
أَنَّهُ لَا يَدَعُ ذِمَّةً عَلَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَالْوُقُوعِ فِيهِ.

”ہشام بن محمد نے ابو مخنف سے اور انہوں نے مجالد بن سعید صقعب ابن زہیر فضیل بن خدیج اور حسین بن عقبہ
مرادی سے روایت کیا ہے کہ ابو مخنف کہتے ہیں کہ ان چاروں نے مجھے آنکھوں کے تھوڑے تھوڑے ٹکڑے
سنائے، لہذا حجر بن عدی کنڈی کا جو واقعہ میں آگے سنا رہا ہوں اس میں ان چاروں کی مختلف روایتیں جمع ہیں۔
واقعہ یہ ہے کہ جب ماہ جمادی ۴۱ھ میں معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے کوفہ پر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ
کو گورنر بنایا تو انہیں بلا کر پہلے اللہ کی حمد و ثناء کی، پھر کہا کہ: ”میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں بہت چیزوں کی نصیحت
کروں، لیکن چونکہ مجھے اعتماد ہے کہ تم مجھے راضی رکھنے، میری سلطنت کو کامیاب بنانے اور میری رعایا کی اصلاح
کرنے پر پوری نظر رکھتے ہو، اس لیے میں ان تمام باتوں کو چھوڑتا ہوں۔ البتہ تمہیں ایک نصیحت کرنا میں ترک
نہیں کر سکتا وہ یہ کہ علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کرنے اور انہیں گالی دینے سے پرہیز نہ کرنا، عثمان رضی اللہ عنہ پر
رحمت بھیجتے رہنا اور ان کے لیے استغفار کرتے رہنا۔ علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب پر محیب لگانا، انہیں دور رکھنا اور
ان کی بات نہ سننا، عثمان رضی اللہ عنہ کے اصحاب کی خوب تعریف کرنا، انہیں قریب رکھنا اور ان کی باتیں سنا
کرنا۔“ ابو مخنف کہتا ہے کہ صقعب بن زہیر نے کہا کہ میں نے شععی کو کہتے ہوئے سنا کہ: ”...مغیرہ رضی اللہ عنہ
کوفہ میں، معاویہ رضی اللہ عنہ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے وہ بہترین سیرت کے مالک
تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے پسند کرتے تھے، البتہ وہ علی رضی اللہ عنہ کی مذمت اور انہیں برا بھلا کہنا نہیں

لعن طعن سے تعبیر کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب راوی حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ صراحتاً نقل کر رہے ہیں تو فیصلہ ان الفاظ پر کیا جائے گا نہ کہ اس تاثر پر جو ان الفاظ سے راویوں نے لیا، یا اس تعبیر پر ”روایت بالمعنی“ میں انہوں نے اختیار کی۔

پھر دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ ابن جریر نے یہ روایت جس سند کے ساتھ نقل کی ہے، وہ اول سے آخر تک شیعہ یا کذاب اور جھوٹے راویوں پر مشتمل ہے۔ اس روایت کا پہلا راوی ہشام بن الکلیبی ہے جو مشہور راوی محمد بن السائب الکلبی کا بیٹا ہے، اس کے بارے میں ابن عساکر کا قول ہے کہ:

رافضی، لیس بثقة

وہ رافضی ہے، ثقہ نہیں۔ ﴿لسان المیزان، ج ۶، ص ۱۹۶، دائرة المعارف ۱۳۲۰ھ﴾

اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن ابی طیٰ نے اسے امامیہ (شیعوں کا ایک فرقہ) میں شمار کیا ہے اور ابن ابی یعقوب حریریؒ فرماتے ہیں کہ:

راویة للمثالب غایة

انتہادرجے کی مثالب روایت کرتا ہے

پھر دوسرا راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن عدیؒ فرماتے ہیں:

شیعی محترق صاحب اخبارهم

جلا بھنا شیعہ ہے اور انہی کی روایت کا ذکر کرتا ہے۔ ﴿لسان المیزان، ج ۶، ص ۱۹۷، دائرة المعارف

۱۳۲۰ھ﴾

تیسرا راوی مجالد بن سعید ہے، ان کے ضعیف ہونے پر تو تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے ہی، یہاں تک کہ تاریخی روایات میں بھی انہیں ضعیف مانا گیا ہے۔ امام یحییٰ بن سعید قطانؒ کے کوئی دوست کہیں جا رہے تھے، انہوں نے پوچھا: ”کہاں جا رہے ہو؟“ انہوں نے کہا: ”وہب بن جریر کے پاس جا رہا ہوں، وہ سیرت کی

کچھ کتابیں اپنے باپ سے بواسطہ مجالد سنا تے ہیں۔“ یحییٰ بن سعید نے فرمایا: ”تم بہت جھوٹ لکھ کر لاؤ گے۔“
 ﴿ابوحاتم الرازی﴾ کتاب المخرج والتعديل، ج ۴، ص ۳۶۱، قسم اول، دائرة المعارف دکن ۱۳۷۲ھ و تہذیب
 العہدیب ایضاً، ج ۱۰، ص ۴۰، ۱۳۲۶ھ ﴿

اس کے علاوہ اٹح کا قول ہے کہ: ”یہ شیعہ ہے۔“ ﴿میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۲۳۸﴾
 چوتھے راوی فضیل بن خدیج ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابوحاتم
 کا قول ہے کہ: ”فضیل بن خدیج اشتر کے غلام سے روایت کرتا ہے، مجہول ہے اور جو راوی اس سے روایت کرتا
 ہے وہ متروک ہے۔“ ﴿میزان الاعتدال ج ۲، ص ۳۳۲، لسان المیزان ج ۲، ص ۲۵۳﴾
 ان کے علاوہ دو راوی جن کا ذکر ابو جعفر نے کیا ہے، یعنی صقعب بن زہیر اور فضیل بن خدیج، وہ تو
 سرے سے مجہول ہی ہیں۔ (صقعب بن زہیر کو اگرچہ امام ابو زرعةؒ نے ثقہ قرار دیا ہے مگر اس کے بارے میں ابو
 حاتم رازیؒ فرماتے ہیں کہ:

شیخ لیس بمشہور ﴿المخرج والتعديل، ج ۲، قسم ۱، ص ۲۵۵﴾

اور فضیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

هو مجہول روی عنه رجل متروک الحدیث ﴿المخرج والتعديل، ج ۳، قسم ۲، ص ۷۲﴾

اب آپ غور فرمائیے کہ جس روایت کے تمام راوی از اول تا آخر شیعہ ہوں اور ان میں سے بعض نے
 مقصد ہی یہ بنا رکھا ہو کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف بری بھلی باتیں منسوب کریں۔ کیا ایسی
 روایت کے ذریعے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی الزام عائد
 کرنا سراسر ظلم نہ ہوگا؟ مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ: ”میں تاضی ابوبکر بن العربیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کی
 کتابوں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود تحقیق کر کے آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان
 بزرگوں نے اپنی کتابیں شیعوں کے رد میں لکھی ہیں لہذا ان کی حیثیت ”وکیل صفائی“ کی سی ہو گئی ہے۔“
 ﴿خلافت و ملوکیت، ص ۳۲۰﴾

اب مودودی صاحب خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا یہ غیر جانبداری کا تقاضا ہے کہ ”وکیل صفائی“ کی بات تو سنی ہی نہ جائے۔ خواہ کتنی ثقہ، قابل اعتماد اور قابل احترام شخصیت ہو اور دوسری طرف ”مدعی“ کی بات کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیا جائے خواہ وہ کتنا ہی جھوٹا اور افتراء پرداز ہو؟ تاقی ابو بکر بن العربیؒ اور ابن تیمیہؒ (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دشمن نہیں، صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ثقہ دوست ہیں۔ دوسری طرف ہشام بن الکسبی اور ابو جعفر، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کھلے دشمن ہیں اور ان کی افتراء پردازی ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ثابت ہے، یہ آخر غیر جانبداری کا کون سا تقاضا ہے کہ پہلے فریق کی روایات سے صرف ان کے ”حب معاویہ رضی اللہ عنہ“ کی وجہ سے یکسر پرہیز کیا جائے اور دوسرے فریق کی روایات پر ان کے ”بغض معاویہ رضی اللہ عنہ“ کے باوجود کوئی تنقید ہی نہ کی جائے؟

مودودی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ: ”بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لیے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے۔ یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لیے اختیار کیے ہیں۔۔۔ الخ“۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ”اس لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابن سعد، ابن عبد البر، ابن کثیر، ابن جریر، ابن حجر اور ان جیسے دوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں سے نقل کیے ہیں انہیں رد کر دیا جائے۔۔۔ الخ“۔ ﴿خلافت و ملوکیت، ص ۳۱۷ تا ۳۱۹﴾

یہاں سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخی روایات میں سند کی جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جو روایتیں ان مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کر دی ہیں، انہیں بس آنکھ بند کر کے قبول ہی کر لینا چاہیے تو آخر ان حضرات نے تقریباً ہر روایت کے شروع میں سند کو نقل کرنے کی زحمت ہی کیوں اٹھائی؟ کیا اس طرز عمل کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایات کے صحت و سقم کی ذمہ داری اپنے قارئین اور محققین پر ڈال رہے ہیں کہ مواد ہم نے جمع کر دیا، اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے تحقیق و تنقید کے کسوٹی پر پرکھو اور

اہم نتائج اخذ کرنے کے لیے صرف ان روایت پر بھروسہ کرو جو تحقیق و تنقید کے معیار پر پوری اترتی ہوں۔ ورنہ اگر تاریخی روایات کے معاملے میں ”اسماء الرجال کی کتابیں کھول کرنے بیٹھ جائے“ کی ممانعت کر دی جائے، تو خدا را مودودی صاحب یہ بتلائیں کہ ابن جریر نے جو یہ نقل کیا ہے کہ: ”حضرت داؤد علیہ السلام (معاذ اللہ) وریا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے اس لیے اسے متعدد خطرناک جنگی مہمات پر روانہ کر کے اسے مروادیا پھر اس کی بیوی سے شادی کر لی۔“ اسے رد کر دینے کی آخر کیا وجہ ہے؟ نیز ابن جریر نے جو اپنی تاریخ میں بے شمار متعارض احادیث نقل کی ہیں، ان میں ترجیح آخر کس بناء پر دی جاسکے گی؟

تطویل سے بچنے کے لیے ہم اس بحث کو یہاں چھوڑتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کے درمیان معیار صحت کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ ہم چونکہ یہاں خاص اس روایت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جس سے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کیا کرتے تھے، اس لیے مختصر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ روایت کیوں ناقابل قبول ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اور حدیث کے فرق کو ملحوظ رکھنے کے باوجود مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر مودودی صاحب کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ روایت قطعی طور پر ناقابل اعتماد ہے:

۱۔ اس کے راوی سارے کے سارے شیعہ ہیں اور کسی روایت سے جو صرف شیعوں سے منقول ہو، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

۲۔ اس کے تمام راوی ضعیف یا مجہول ہیں اور ایسی روایت تاریخ کے عام واقعات کے معاملے میں تو کسی درجہ میں شاید قابل قبول ہو سکتی ہو، لیکن اس کے ذریعے کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہو سکتی جس سے کسی صحابی رضی اللہ عنہم کی ذات مجروح ہوتی ہو۔

۳۔ یہ روایت، درایت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی، اس لیے کہ اگر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے سات سال سے زائد مدت تک منبروں پر کھڑے ہو کر حضرت علیؑ

پر ”سب و شتم کی بوچھاڑ“ کرتے رہے تو:

الف۔ اس ”سب و شتم“ کی روایت کرنے والے تو بے شمار ہونے چاہئیں، یہ صرف ایک شخص ہی اس کی روایت کیوں کر رہا ہے؟ اور ایک بھی وہ جو شیعہ ہے اور اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے؟

ب۔ کیا پوری ملت اسلامیہ اپنے ”خیر القرون“ میں ایسے اہل جرأت اور انصاف سے قطعی طور پر خالی ہو گئی تھی جو اس ”مکروہ بدعت“ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے کورنروں کو روکتے، کیا حضرت حجر بن عدیؓ کے علاوہ کوئی باغیرت مسلمان کوفہ میں موجود نہیں تھا؟

ج۔ عدالت و دیانت کا معاملہ تو بہت بلند ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عقل و تدبیر اور سیاسی بصیرت سے تو ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہوگا، کیا یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ان جیسا صاحب فراست انسان محض بغض کے جذبات میں بہہ کر ایک ایسا بے فائدہ اقدام کرے جو اس کی حکومت کے استحکام کے لیے خطرہ بن سکتا ہے؟ کوفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معتقدین کا مرکز تھا، کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ”سب و شتم“ کروا کر یہ چاہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی اہل کوفہ سے براہ لڑائی ٹھنی رہی اور وہ کبھی دل سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ ہوں؟ کوئی گھٹیا سے گھٹیا سیاست دان بھی کبھی یہ نہیں کر سکتا کہ اپنے مخالف قائد کے مرنے کے بعد اس قائد کے معتقدین کے گڑھ میں بلا وجہ اسے گالیاں دیا کرے۔ ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنی حکومت کے خلاف بھڑکانے کا شوق ہو۔ (مودودی صاحب تو اس قسم کے درایتی قرائن کی بناء پر بالکل صحیح الاسناد احادیث کو بھی رد کر دینے کے قائل ہیں، چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کو صحیح الاسناد ماننے کے باوجود مودودی صاحب نے اس لیے رد کر دیا ہے کہ وہ درایت کے اس جیسے قرائن کے خلاف ہے، حالانکہ وہ حدیث بھی کوئی ”احکامی حدیث“ نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہی ہے۔ کیا اس موقع پر وہ درایت کے ان قرائن کی بناء پر ایک سراسر ضعیف روایت کو رد نہیں کریں گے؟)

ان وجوہ کی بناء پر یہ روایت تو قطعی طور پر ناقابل قبول ہے۔ دوسری روایت جس کا حوالہ مودودی

صاحب نے دیا ہے **البدایہ والنہایہ** کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

ولما کان (مروان) متولیا علی المدینة لمعاویة رضی اللہ عنہ کان یسب علیا رضی اللہ عنہ کل جمعة علی المنبر وقال له الحسن بن علی رضی اللہ عنہما : لقد لعن اللہ اباک الحکم وانت فی صلبہ علی لسان نبیہ فقال له لعن اللہ الحکم وما ولد واللہ اعلم

”جب مروان مدینہ منورہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا گورنر تھا، اس وقت وہ ہر جمعہ کو منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہم پر سب و شتم کیا کرتا تھا اور اس سے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تیرے باپ حُکَم پر اللہ نے اپنے نبی ﷺ کی زبان سے اس وقت لعنت کی تھی جب تو اس کی صلب میں تھا اور یہ کہا تھا کہ حُکَم اور اس کی اولاد پر خدا کی لعنت ہو۔“ (البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۲۵۹) ﴿

اگرچہ یہ روایت کئی وجہ سے مشکوک ہے۔ (اول تو اس لیے کہ یہ پوری عبارت البدایہ والنہایہ کے اصل مصری نسخے میں موجود نہیں ہے، دوسرے اس لیے کہ اس کے آخر میں آنحضرت ﷺ کی طرف جو الفاظ منسوب کیے گئے ہیں وہ بہت مشکوک ہیں) لیکن اتنی بات کچھ اور روایتوں سے بھی مجموعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مروان بن الحکم مدینہ منورہ کی گورنری کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو محبوب رکھنے والوں کو ناگوار گزرتے تھے۔ لیکن یہ نازیبا الفاظ کیا تھے؟ ان تاریخی روایتوں میں سے کسی میں ان کا ذکر نہیں البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ایک واقعہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ:

ان رجلاً جاء الی سهل رضی اللہ عنہ بن سعد فقال هذا فلان لامیر المدینة یدعو علیا رضی اللہ عنہ عند المنبر قال فیقول ماذا قال یقول له ابوتراب فضدک وقال واللہ ما سماء الا النبی ﷺ وما کان له اسم احب الیہ منه

”ایک شخص حضرت سہل رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور بولا کہ امیر مدینہ منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو

ہوئے حوالے کے اندر یا اور کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کیا کرتا تھا۔

۴۔ سب و شتم کی بوچھاڑ کا لفظ بھی بلا دلیل ہے، اس لیے کہ مودودی صاحب کے دیے ہوئے حوالے میں تو سب و شتم کے الفاظ منقول نہیں۔ صحیح بخاری کی روایت سے جو الفاظ معلوم ہوتے ہیں انہیں ”سب و شتم“ کھینچ ناں کر ہی کہا جاسکتا ہے۔

۵۔ دوسرے کو نیز حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مودودی صاحب نے حوالہ صحیح دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس میں یہ تصریح ہے کہ وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بددعا کیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ روایت از اول تا آخر سارے کے سارے شیعہ راویوں سے مروی ہے اور روایت و درایت ہر اعتبار سے واجب الرد ہے۔